ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

# ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے معاشی حالات: شوکت صدیقی کے اختصاصی حوالے سے

# Pakistan,s Economic Situation after 1947: With Reference To Shaukat Saddiqui

*صائمہ اقبال
**روبینہ کوثر

***Abstract:***
*The situation arising out of the partition of the country in 1947 and aftermath had a physical, mental,political and economic impact on the people of the Indian Subcontinent. Writers aand artists were also personally influenced by him. The novels of this period reflect the different classes and their economic problems. These economic problems have been looked at and presented by novelists from different angles. An important name among these novelists is Shaukat Siddique, who portrayed the economic situation immediately after partition in his novels. This article provides an overview of the economic concepts contained in his novels "Khuda ki Basti" and " Jangloos"*
*Key words: Partition of Pakistan, 1947, Economic,Shaukat Siddique, novels, "Khuda ki Basti" "Jangloos" Concluded*

## تمہید

اللہ رب العزت نے اپنی حکمت بالغہ سے ہمارے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی وسیع و عریض کائنات کو تخلیق کیا۔ اس کی ہواؤں ، فضاؤں ، سمندروں اور زمینوں کو وسائل و حیات سے مامور کر دیا اور ان سے اپنی ان گنت مخلوقات کی رزق رسانی کا اہتمام فرمایا اور اسی نے اپنی تخلیق کے شاہکار انسان کو احسن تقویم پیدا کیا۔ پھر اس کو قلت و کمیابی سے دوچار کر کے کائنات کو اس کے لیے مسخر کر دیا۔ انسان کا معاشی مسئلہ روئے زمین پر اس کی تخلیق کے ساتھ ہی وجود میں آ گیا تھا۔ انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ مزید پھیلتا گیا۔ انسان کی تخلیق کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ اپنی پیدائش کے دن سے ہی خواہشات اور حاجات میں گھرا ہوا ہے۔ انسان نے جس دن سے اس دھرتی پر قدم رکھا ہے اسی دن سے بھوک مٹانے اور پیاس بجھانے کے لیے اشیاء خورد و نوش کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

---

*لیکچرار شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
**اسکالر پی۔ ایچ۔ ڈی شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

چنانچہ معیشت سے مراد وہ اشیاء ہیں جو انسانی زندگی کا لازمی جز ہیں جن پر انسانی زندگی کی بقاء کا انحصار ہے اس میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جن سے انسان زندگی بسر کرتا ہے اس کے علاوہ اس کو وسیلہ زندگی بھی کہہ سکتے ہیں۔ فیروز اللغات میں معیشت کی معنی ان الفاظ میں بیان ہوئے ہیں:

"معیشت زندگی، زندگانی، زیست، حیات، عیش، روزگار، روزی۔"(۱)

قرآن پاک میں بھی لفظ "معاش" لغوی معنوں میں روزی اور ذریعہ زندگی کے مفہوم کے طور پر آیا ہے چنانچہ فرمایا:

''وَ جَعَلنَا النهارَ مَعَاشًا ''

ترجمہ: "ہم نے دن کو معاش کا وقت مقرر کیا۔"(۲)

ایک اور جگہ فرمایا :

'' و کم اهلکنا من قریت بطرت معیشتها ''

ترجمہ :"اور ہم نے بہت سی بستیاں ہلاک کیں کہ اتراتی تھیں اپنی معیشت پر۔"(۳)

'Encyclopedia of social science" میں معاشیات کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"-Economic deals with a social phenomenon centering about the provision for the material needs of an individual and of the organized group"(4)

چنانچہ معیشت سے مراد وہ اشیاء ہیں جو انسانی زندگی کا لازمی جز ہیں جن پر انسانی زندگی کی بقاء کا انحصار ہے اس میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جن سے انسان زندگی بسر کرتا ہے اس کے علاوہ اس کو وسیلہ زندگی بھی کہہ سکتے ہیں۔ نور محمد غفاریِ کے مطابق:

"معاشیات ان وسائل کے علم کا نام ہے جنہیں انسان اس (مال یا معاش یا ذرائع معاش) سے استفادہ کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ جس میں (اللہ کریم کی طرف سے) امین و نگران بنایا گیا ہے۔ تاکہ اس طرح شریعت کے مقررہ نہج (طریقہ) کے مطابق فرد اور معاشرہ کی (معاشی) حاجات کی تکمیل ہو۔"(۵)

دور جدید میں اقتصادیات سے مراد بھی مالی اور معاشی امور لیے جاتے ہیں لہذا اصطلاحاً اقتصادیات سے مراد وہ علم ہو گا جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم سے بحث کی بجاتی ہے۔ علم اقتصاد ہر اس شے سے بحث کرتا ہے جو کثرت مال وزر، رزق کمانے، کسی شے کا مالک ہونے اور خرچ کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں ملکی تقسیم اور اس کے بعد کے واقعات کے نتیجے میں پیدا ہونی والی صورت حال نے برصغیر پاک و ہند کی عوام پر جسمانی، ذہنی، سیاسی اور معاشی اثرات مرتب کیے۔ ادیب اور فن کار بھی ذاتی طور پر ان سے متاثر ہوئے۔ ان لکھنے والوں میں

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد، عبد اللہ حسین اور شوکت صدیقی خاص طور پر اہم ہیں۔ اس دور میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ اس پورے دور میں معاشی مسائل کی تصویر کشی ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ اس دور کے ناولوں میں مختلف طبقات اور ان کے معاشی مسائل کی عکاسی نمایاں طور پر ملتی ہے۔ ان معاشی مسائل کو ناول نگاروں نے الگ الگ زاویہ نظر سے دیکھا اور پیش کیا ہے۔ ان ناول نگاروں میں ایک اہم نام شوکت صدیقی کا ہے، جنھوں نے تقسیم کے فوراً بعد کے معاشی حالات کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں ان کے ناولوں ' خدا کی بستی' اور ' جانگلوس' میں موجود معاشی تصورات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

## شوکت صدیقی

شوکت صدیقی ۲۰ / مارچ / ۱۹۲۳ء کو برطانوی ہندوستان کے علاقے لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہ مشہور ناول نگار، افسانہ نگار اور ممتاز صحافی ہیں۔ آپ روز نامہ 'مساوات' کراچی کے بانی ایڈیٹر اور روز نامہ ' مساوات' لاہور اور روز نامہ ' انجام' کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کے مشہور ناولوں میں کمین گاہ(۱۹۵۶ء) خدا کی بستی ( ۱۹۵۸ء) جانگلوس(تین جلدیں، ۱۹۸۸ء)اور چار دیواری (۱۹۹۰) ہیں۔ آپ نے ۲۰۰۶ء میں وفات پائی۔

## خدا کی بستی

شوکت صدیقی نے ناول 'خدا کی بستی ' ۱۹۵۸ء میں لکھا۔ اس ناول میں قیام پاکستان کے بعد کے نیم سرمایہ دارانہ معاشرے میں جمہوریت، انسانیت اور مذہب کی آڑ میں معاشی استحصال کے حوالے سے معاشی تصورات کو پیش کیا گیا ہے۔ ہماری روز مرہ زندگی کے مسائل اور تلخ حقائق کو مختلف پیشوں کی وساطت سے اس ناول میں پیش کیا گیا ہے جس کو پڑھ کر قاری کی روح کانپ جاتی ہے۔

اس ناول میں معاشی لحاظ سے تین طبقات بیان کیے گئے ہیں۔ ایک سرمایہ دار طبقہ ہے اور دوسرا متوسط طبقہ ہے اور تیسرا جرائم پیشہ افراد کا طبقہ ہے۔ اس ناول میں آنے والے اہم کردار اور ان کے پیشے مندرجہ ذیل ہیں۔

اس ناول میں معاشی حوالے سے تین طبقات پر بات ہوئی ہے۔ ایک سرمایہ دار طبقہ ہے جس کا نمائندہ نواب فرزند علی خاں ہے جو سیاست دان ہے۔ دوسرا طبقہ متوسط طبقہ ہے جس میں نوشا ہے جو مزدور ہے، راجہ بھکاری ہے، شامی اخبار فروش اور ایک دکان دار کا بیٹا ہے، ڈاکٹر موٹو جیسے کے نام سے ظاہر ہے عام چھوٹا سا ڈاکٹر ہے، سلیمان طالب علم ہے اور متوسط خاندان سے تعلق رکھتا ہے، عبد اللہ مستری ورکشاپ پر کام کرتا ہے اور احمد علی فلک پیما تنظیم کار رہنما ہے۔ اس کے علاوہ تیسرا طبقہ جرائم پیشہ افراد کا ہے۔ جس میں نیاز کباڑیہ ہے، شاہ جی چور گینگ کا سرغنہ ہے اور پوکر فلکرٹ جیب مار ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

اس ناول کے مرکزی کردار راجا اور نوشا اور شامی ہے۔ یہ تینوں معاشی حوالے سے متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ معاشی حالات کی تنگدستی کی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے۔ اچھے ماحول سے مرحوم ہونے کی وجہ سے بہتر ذرائع معاش کے سلسلے میں کراچی بھاگ جاتے ہیں، وہاں جا کر شاہ جی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جو چور گینگ کا سرغنہ ہے۔ اس طرح ان کی معاشی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے۔

نوشا کی ماں بیڑی کے ایک کارخانے میں بیڑیاں بنا کر اپنے گھر کے دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرتی ہے۔ معاشی لحاظ سے بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ نوشا جب کراچی بھاگ جاتا ہے تو اس کے بعد یہ معمولی ذریعہ معاش بھی ختم ہو جاتا ہے۔ آخر کار معاشی بدحالی سے مجبور ہو کر وہ نیاز کباڑیہ سے شادی کر لیتی ہے۔

نیاز نے جعل سازی کی وجہ سے بہت سی دولت حاصل کی تھی۔ پہلے تو اس نے رضیہ کی انشورنس کی رقم ہتھیائی پھر نواب فرزند علی خان کا کارندہ بن کر جرائم کرتا ہے۔ آخر کار وہ اپنے غلط دھندوں کی وجہ سے نوشا کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ راجہ کراچی پہنچ کر جب شاہ جی کے ہتھے چڑھتا ہے تو وہ وہاں سے بھاگ جاتا ہے آخر کار وہ بھی کوڑھ کا مریض بن کر بھکاریوں کی زندگی گزارتا ہے۔

خان بہادر فرزند علی خان لوگوں کا معاشی استحصال کرتا ہے۔ یہی معاشی لوٹ کھسوٹ اس کا ذریعہ معاش ہے۔ اس کے علاوہ وہ میونسپل بورڈ کا چیرمین بھی ہے۔ نیاز کے قتل ہو جانے کے بعد سلطانہ کو گھر سے نکال کر اس کی جائیداد پر قبضہ کر لیتا ہے۔

اس ناول میں فلک پیما تنظیم بھی ہے جو معاشی لحاظ سے متوسط اور نچلے طبقے کی معاشی امداد بھی کرتے ہے۔ وہ محدود معاشی وسائل کے باوجود غریب مجبور اور نادار لوگوں کی مالی امداد کرتے ہیں۔

شوکت صدیقی نے اپنے ناول ' خدا کی بستی ' میں ایک ایسے دور کی معاشی صورت حال کو بیان کیا ہے جب پاکستان کو بنے ابھی چند سال ہوئے تھے۔ انھوں نے معاشی استحصال کو چند طبقات کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل یہ ناول نگار کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ذرائع معاش انسانی زندگی میں کس قدر دخیل ہیں۔ گھر میں کھانا نہ ہو تو مائیں ہی اپنے بچوں کی دشمن بن جاتی ہیں۔ اچھے ماحول کی تلاش میں گھر سے بھاگے ہوئے بچے کس طرح ظالم لوگوں کے ہتھے چڑھ کر اپنی زندگیاں برباد کر لیتے ہیں۔ شوکت صدیقی لکھتے ہیں :

> "میں نے زندگی کو قحبہ خانوں میں دیکھا ہے۔ جھگیوں اور تنگ و تاریک گلیوں میں دیکھا ہے۔ مسلسل فاقے کیے ہیں۔ ذلتیں برداشت کی ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد تجربہ حاصل کیا ہے۔ زندگی کو برہنہ آنکھ سے دیکھے کس قدر مظلوم ہے۔"(۶)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

شوکت صدیقی کے اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا معاشی شعور صرف کتابی نہ تھا بلکہ انھوں نے خود معاشی حالات کے ہاتھوں مجبور اور بے بس اور دوسری طرف معاشی خوشحالی کو (جو صرف امیر طبقے کا حق ہے) دکھا ہے۔ 'خدا کی بستی' کے تمام مرکزی کردار جس میں مجبور اور نادار لوگ بھی شامل ہیں اور زر پرست استحصالی طبقہ بھی شامل ہے جو پاکستان کے قیام کے فوراً بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس وقت صورت حال ہی ایسی تھی کہ معیشت تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ غریب طبقہ کے پاس ذرائع معاش نہ ہونے کے برابر تھے بلکہ آئے دن کی ہڑتالوں سے وہ بھی ختم ہو رہے تھے۔ دوسری طرف ان کو لوٹنے والا طبقہ تھا۔ جن کے خزانوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر محمد عارف اس معاشی صورت حال کے حوالے سے لکھتے ہیں :

> "خدا کی بستی" قیام پاکستان کے دس سال بعد ۱۹۵۷ء کی تصنیف ہے۔ اس عہد میں سیاست دان حکمران تھے۔ سیاست شطرنج کی کھیل کی طرح کھیلی جا رہی تھی۔ اصل حکمران برطانوی سامراج کی تربیت یافتہ بیوروکریسی اور خاں بہادر جیسے جاگیر دار تھے۔۔۔۔ ہر طرف جبر تھا، تشدد اور غربت تھی۔ بے روزگاری تھی اور بیماری، سیاسی تاریکیوں کا راج تھا اور امید کی کرن کا نشان نہیں تھا۔" (۷)

'خدا کی بستی' میں کرداروں کا انفرادی جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کرداروں کا معاشی استحصال دراصل ایک بگڑے ہوئے معاشرتی و معاشی نظام کی وجہ سے ہے۔ یہ بگاڑ معاشرے کے رگ رگ میں پھیل چکا ہے۔ لوگوں کے پاس ذرائع معاش نہ ہونے کے برابر ہیں۔ روزگار کی کمی کی وجہ سے لوگ جرائم کے راستے پر چل نکلے ہیں اور معاش کے ناجائز ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں۔ ہر طرف چوری چکاری اور قتل و غارت عام ہے۔ سارے کا سارا معاشرہ شر و فساد میں مبتلا ہے۔ اور ان لوگوں کی اصلاح کرنے والا بھی صحیح سمت ان کی رہنمائی نہیں کرتا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے ایک بگڑے ہوئے معاشرے کے حوالے سے معاشی تصورات پیش کیے ہیں۔

شوکت صدیقی نے اس ناول میں معاشی استحصال کے بیان میں اپنے کرداروں کو طبقات میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان میں ایک طبقہ استحصال کرنے والا ہے اور دوسرا جن کے ساتھ معاشی استحصال ہو رہا ہے۔ ایک جابر اور دوسرا مجبور طبقہ، ایک ظالم زمیندار اور دوسرا مظلوم کسان۔ زندگی کو خوبصورت بنانے کے تمام معاشی مواقع نسل در نسل جاگیر داروں، سرمایہ داروں، ملکی غداروں اور بڑے چوروں کے پاس ہیں اور معاشی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے مر مر کر جیے جانے کے لیے مجبور فاقہ کش چھوٹے لوگ ہیں۔ جو اپنے معاشی مسائل سے تنگ آ کر یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر جیل میں جا کر سزائے موت یا عمر قید کے حق دار قرار پاتے ہیں۔ اس معاشی اونچ نیچ کے حوالے سے معاشی تصور کو مصنف اس طرح بیان کرتے ہیں :

> " نوشا جیل میں تھا اور پھانسی کے پھندے کے سائے میں کھڑا تھا اور خان بہادر فرزند علی کے فرزند بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اپنے مستقبل کی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

روشن صبح کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ یہ خواص اور عوام کی قسمت کا فرق ہے۔ خواص، خان بہادر فرزند علی پیدا کرتے ہیں اور عوام نوشا، راجہ، شامی اور انو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں کوئی قتل کر کے جیل جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بن کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کے موت کا انتظار کرتا ہے، کوئی رکشہ کھینچتا ہے اور تپ دق میں مبتلا ہو کر خون تھوکتا ہے اور کوئی ہیجڑوں کے ساتھ تالیاں پٹخار کر کولہے مٹکاتا ہے۔" (۸)

نواب فرزند علی خاں سرمایہ دار بھی ہے اور زمیندار بھی ہے۔ میونسپلٹی کا چیرمین اور کئی کارخانوں کا مالک ہے۔ اس کے پاس پنجاب اور سندھ میں زرعی املاک اور جاگیریں بھی ہیں۔ صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کی تیاری بھی کر رہا ہے۔ اس کا ایک بیٹا کولمبو پلان کے تحت لندن میں ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ دوسرا بیٹا فورڈ فاؤنڈیشن کے اسکالر شپ پر کولمبیا یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ دوسری طرف نوشا جیل میں تھا، راجہ کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہو کر ایک گندے سے خیمے میں خارش زدہ کتے کی رفاقت میں اپنی جان کھو چکا تھا۔ شامی بھی بے بسی کی حالت میں مر جاتا ہے۔ سلطانہ کے ساتھ ناجائز سلوک ہوتا ہے۔ انّو روزی کمانے کے لیے ہیجڑوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو معاشی استحصال کا شکار ہیں۔ یہ لوگ اپنی پوری زندگی دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور آخر کار اپنی زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس طرح شوکت صدیقی نے اس ناول میں اعلیٰ طبقے کی معاشی عیاشیوں اور متوسط طبقے کے معاشی استحصال کے حوالے سے معاشی تصورات کو پیش کیا ہے۔

'خدا کی بستی' میں ڈاکٹر موٹو، نیاز کباڑیہ، خاں بہادر، شاہ جی اور عبداللہ مستری ایسے ہی سرمایہ دارنہ طبقے سے ہیں جو اپنے فائدے کے لیے غریب طبقے کا معاشی استحصال کرتے ہیں۔ نیاز کباڑیہ ایک ایسا انسان ہے جو اپنی ضرورت کے لیے کوئی بھی غیر اخلاقی حرکت کر سکتا ہے۔ شوکت صدیقی نے نیاز کی صورت میں سرمایہ دارنہ ذہنیت کے حوالے سے معاشی تصور کی بھیانک عکاسی کی ہے۔ اس کے ناجائز ذریعہ معاش کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

"نیاز کی دکان بازار سے ذرا ہٹ کر گلی کے اندر تھی۔ پہلے وہ فرنیچر تیار کرنے والے ایک کارخانہ میں ملازم تھا۔ مگر اب اس نے اپنی دکان کھول لی تھی اور استعمال شدہ اشیاء بیچنے اور خریدنے کا کاروبار کرتا تھا۔۔۔ کہنے کو تو وہ کباڑیہ تھا۔ مگر کام دراصل کرتا تھا چوری کے مال کی خرید و فروخت کا۔"(۹)

نیاز کا ذریعہ معاش چوری کی چیزیں خرید کر بیچنا تھا۔ وہ دولت مند بننے کے لیے محلے کے بچوں کو چیزیں چوری کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ بیمے کی رقم ہتھیانے کے لیے نوشا کی ماں سے پہلے شادی کرتا ہے اور پھر زہر دلوا کر مار ڈالتا ہے، جس سے اس کو اتنی دولت ملتی ہے کہ اس کی مالی حالت بدل جاتی ہے۔ نیاز ایک ایسا خود غرض، لالچی اور بد چلن شخص ہے جو سرمایہ دارانہ سوچ اور رویے کے حوالے معاشی تصورات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ وہ معاشی حوالے سے مضبوط ہونے کے لیے ہر غلط رویہ اختیار کرتا ہے۔ اس نے کمبلوں کی ایک الاٹ ملٹری ڈپو کے ڈسپوزل سے خرید لی۔ لیکن جب وہ الاٹ کھولی گئی تو

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

سارے کمبل گل کر خراب ہو گئے تھے۔ اس کو اٹھارہ ہزار کا نقصان ہوا۔ اس نقصان کی بھرپائی کے لیے وہ رضیہ کا بیمہ کرواتا ہے۔ تاکہ اس کے مرنے کے بعد وہ رقم کے ذریعے اپنا نقصان پورا کر سکے۔ اس کے بعد اس نے نواب فرزند علی خان کی مدد سے وہی الاٹ سیلاب زدگان کو بھیج دی۔ اس کے پچیس ہزار روپے وصول کیے۔ دس ہزار نیاز، دس ہزار نواب فرزند نے اور پانچ ہزار اس افسر کو دیئے جس نے یہ کمبلوں کی الاٹ کی چیکنگ کرنی تھی۔ دوسری طرف نیاز کا معاشی لالچ اس قدر بڑھ گیا کہ بیمہ کی رقم ہتھیانے کے لیے رضیہ کو کس طرح بے دردی سے قتل کیا اس کی ایک بھیانک تصویر شوکت صدیقی اس طرح پیش کرتے ہیں :

> ”علاج کرتے ہوئے چوتھا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ نیاز کو ڈاکٹر موٹو کی رقم کی فکر تھی۔ وہ ایک ہزار تو دے سکتا تھا۔ مگر اتنی رقم نکل جاتی تو اس کی دکان دکان ٹھپ ہو جاتی۔ ان دنوں وہ دو ڈھائی ہزار کے لوٹ پھیر سے کاروبار چلا رہا تھا۔ نیاز کی یہ پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ رہ رہ کر سوچتا تھا کہ ڈاکٹر نے اگر انجکش لگانے بند کر دیئے تو بہت بُرا ہو گا۔ انشورنس کی پہلی ششماہی قسط جو اس نے کئی ہزار روپے کی صورت میں ادا کی تھی ڈوب جائے گی۔ بغیر انجکشنوں کے بیمہ پالیسی جاری رکھنا فضول تھا۔“ (۱۰)

نیاز کے ہاتھوں لحہ لحہ موت کے منہ میں جاتی نوشا کی ماں ہمارے سامنے اس ہوس پرست معاشرے کا وہ پہلو بے نقاب کرتی ہے جو ایک طرف تو قاری کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیتی ہے تو دوسری جانب صرف دولت کی خاطر انسانی اور مذہبی قدروں کو ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے دکھا دیتی ہے۔ مصنف نے رضیہ کی موت، نیاز کی دولت کی ہوس، ناجائز ذریعہ معاش کے حوالے سے معاشی تصورات کو پیش کیا ہے اور یہ تصورات سرمایہ دارانہ نظام کے آئینہ دار ہے۔

اس ناول میں ایک اہم کردار ’ڈاکٹر موٹو‘ کا ہے۔ اس نے اپنے جائز ذریعہ معاش کو اپنے معاشی فائدے کی خاطر حرام بنالیا ہے۔ اس کا اصل نام ’ خیرات محمد‘ تھا۔ یہ کرنال میں کمپاؤنڈر کا کام کرتا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آکر کراچی میں اپنے نام کے ساتھ باگس ڈگری لگا کر پریکٹس شروع کر دیتا ہے۔ وہ کئی بار سنگین مقدمات میں پھنس چکا تھا۔ پیسے کے حصول کے لیے یہ شخص نوشا کی ماں کو زہر کے انجکشن بھی لگا دیتا ہے۔ ڈاکٹر موٹو ایک ایسا کردار ہے جو اپنے پیشے کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اس پیشے کو عوام کی بھلائی کی بجائے ان کے نقصان کے لیے استعمال کرتا ہے۔ شوکت صدیقی اس کردار کی ذہنی پستی کے حوالے سے معاشی تصور کو اس طرح پیش کرتے ہیں :

> ” ڈاکٹر کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک ابھر آئی۔ سرگوشی کے انداز میں بولا ” میرا کہنا مانو سلو پوائزنگ کے چکر میں نہ پڑو۔ یہ طریقہ خطرناک ہے اور اس میں بڑا جھنجھٹ بھی ہے۔“ نیاز کسی قدر ناامید ہو کر بولا۔ ” تو پھر کیا کیا جائے۔؟“ ڈاکٹر نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”گھبراؤ نہیں۔ ذرا صبر سے کام لو، ایسے کاموں کے لیے اب تو ایک

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

سے ایک طریقہ نکل آیا ہے۔" نیاز خاموش بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔"صرف چند انجکشن لگانے ہوں گے جن سے دل کمزور پڑ جائے گا اور حرکت قلب بند ہونے سے موت واقع ہو جائے گی۔اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں ہے۔ڈاکٹر سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔"(۱۱)

اس ناول میں شوکت صدیقی نے یہ بھی معاشی تصور پیش کیا ہے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد ایک ایسا پاکستانی معاشرہ وجود میں آ گیا تھا یہاں ہر جائز اور ناجائز ذریعہ سے دولت کما کر اپنی معاشی حیثیت کو بلند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دراصل یہ لوگ اپنی شناخت اور جڑوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک معاشی حیثیت ہر اخلاقی اور معاشرتی تعلق سے زیادہ ہے۔اس سلسلے میں ہمیں بہت سے سیاست دان بھی نظر آتے ہیں جو دولت کے حصول کے لیے سیاست کو ہی اپنے روزگار کا وسیلہ بنا لیتے ہیں۔خاں بہادر فرزند علی خاں کا کردار انہی لوگوں کا نمائندہ تھا۔یہ اپنے معاشی فائدے کے لیے مذہب کو بھی استعمال کرنے سے نہیں چوکتا ہے۔لوگوں کو اپنے حق میں کرنے کے لیے وہاں راتوں رات مسجد بنا دیتا ہے۔وہ اپنے معاشی مقام و مرتبے کو الیکشن جیتنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔وہ عوام کے ووٹوں کو اپنے پیسے سے خریدتا ہے۔ مصنف اس معاشی صورت تصور کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"خان بہادر اپنی انتخابی مہم پر پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا۔اس کے کارکن چمکتی ہوئی کاروں پر آئے اور ووٹروں کو خریدنے کے لیے نت نئے ریٹ مقرر کرتے۔جوں جوں مقدار انتخابات کی تاریخیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ووٹوں کا ریٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر بستی میں ٹھیکیدار مقرر کر دیے تھے۔ جن کے ایجنٹ ووٹوں کا سودا کرنے میں مصروف تھے۔۔۔ خاں بہادر نے فی ووٹ دس روپے تک مقرر کر دیا تھا۔اس کے تین انتخابی دفتر تھے جن مین آئے دن ضیافت ہوتی۔ دیگیں چڑھتیں،بڑی فیاضی سے مرغن کھانے کھلائے جاتے۔" (۱۲)

اس ناول میں شوکت صدیقی نے خاں بہادر جیسے لوگوں کی صورت میں یہ معاشی تصور پیش کیا ہے کہ ہمیں اپنے گرد و پیش اسے لوگ نظر بھی نظر آتے ہیں جو اپنی معاشی حیثیت اور مقام و مرتبہ بلند کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ طاقت اور اختیارات کا استعمال کرتے ہیں۔اس مقصد کے لیے وہ دوسروں کا معاشی استحصال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔

ناول نگار نے متوسط طبقے کے حوالے سے بھی معاشی تصورات کو پیش کیا ہے۔اس ناول میں نوشا، راجہ اور شامی متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشی حالات کی ابتری کی وجہ سے یہ نیاز کباڑے اور عبد اللہ مستری کے بہکاوے میں آ جاتے ہیں۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

نوشا ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔ اس گھر میں روزی کمانے والا کوئی نہیں ہے ۔گھر کے معاشی نظام کا انحصار اس کی ماں کی کمائی پر ہے۔ وہ گھر والوں کی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے فیکٹری میں بیڑیاں بنانے کا کام کرتی ہے:

"لیمپ کی دھندلی روشنی میں سلطانہ گردن جھکائے قینچی سے بیڑی کے پتے کاٹ رہی تھی۔ قریب ہی ماں بیٹھی تھی۔ جو کٹے ہوئے پتوں میں تمباکو کو بھر بھر کر بیڑیاں بنا رہی تھی۔" (۱۳)

نوشا ایک ورکشاپ پر کام کرتا تھا۔ اس طرح دونوں کے کمانے سے گھر کا گزر بسر ہو رہا تھا۔ نوشہ کے گھر سے چلے جانے سے رضیہ کو معاشی حوالے سے بہت دھچکا لگا۔ اس کے علاوہ وہ جس کارخانے میں کام کرتی تھی وہ بعض وجوہات کے بند ہو گیا تھا۔ یہی اس کے معاش کا ذریعہ تھا جو اس سے چھن گیا۔ مصنف لکھتے ہیں :

"صرف ایک خیال بار بار اس کے ذہن میں سوال بن کر ابھرتا تھا۔ اب کیا ہو گا؟ ہوتا کیا چند ہی روز میں فاقہ کشی کی نوبت آ گئی۔"(۱۴)

آہستہ آہستہ ان کے معاشی حالات خراب ہو گئے۔ رضیہ ان حالات سے نکلنے کے لیے اور بہتر معاشی مستقبل کی خاطر نیاز سے شادی کر لیتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کے اچھے معاشی مستقبل کے لیے خود کو زہر کے ٹیکے بھی لگواتی ہے۔ وہ خود اپنی جان کی قربانی دیتی ہے۔ مصنف نے اس ناول میں معاشی حوالے سے یہ تصور بھی پیش کیا ہے کہ کس طرح اپنی اولاد کے بہتر معاشی مستقبل کی خاطر مائیں اپنی جان کی قربانی دیتی ہیں۔

مصنف نے اس ناول میں بچوں کے معاشی استحصال کے حوالے سے بھی معاشی تصورات کو پیش کیا ہے۔ نوشا، راجہ اور شامی ناول کے تین ایسے کردار ہیں جو عمر کے لحاظ سے ناپختہ ہیں۔ لیکن معاشی مجبوریوں کا شکار ہیں۔ ان معاشی مجبوریوں کی وجہ سے یہ تینوں مختلف پیشے اپناتے ہیں۔ نوشا ایک ورکشاپ میں کام کرتا ہے یہاں اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنی غربت اور معاشی بدحالی کی وجہ سے اس جنسی استحصال کو برداشت کرتا ہے۔

شامی دن کے وقت اخبار بیچتا ہے اور شام کے وقت اپنے ابا کی دکان چلاتا ہے۔ راجہ ایک کوڑھ زدہ فقیر کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ سارا دن اس کی ریڑھی کو دھکا لگاتا ہے اور رات کے وقت اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ یہ تینوں دوست اپنی بدحال معاشی زندگی سے چھٹکارہ حاصل کرنے اور بہتر معاشی زندگی کے حصول کی خاطر کراچی بھاگ جاتے ہیں۔ لیکن وہاں پہنچ کر بھی ان کا معاشی استحصال ختم نہیں ہوتا ہے۔ رحمان نام کا آدمی ان کو 'شاہ جی' کے پاس لے جاتا ہے۔ رحمان کی روزی روٹی کا وسیلہ بھی یہی ہے کہ وہ گھر سے بھاگے ہوئے بچوں کو بہکا کر اپنے ساتھ لے آتا اور مناسب قیمت پر بیچ دیتا تھا۔ رحمان کی صورت میں بھی مصنف نے معاشی تصور کو پیش کیا ہے۔ وہ ان تینوں کا سودا اس طرح کرتا ہے:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

" شاہ جی نے رحمان سے دریافت کیا۔ ہاں جی، اب معاملے کی بات کرو۔ کیا لو گے ؟"
شاہ جی آج تو سیدھے ہاتھ سے سو سو کے بیس کرارے کرارے دلوا دو۔ خدا قسم بڑے کام کے چھوکرے ہیں۔" شاہ جی نے اسے جھڑک دیا۔ ٹھیک ٹھیک بات کر۔ ہزار سے ایک پیسہ زیادہ نہیں ملے گا۔"
ارے شاہ جی، کیا ظلم کر رہے ہو۔ اتنے میں سودا نہ ہو گا۔ واپس بلوا لو۔ ابھی تو انہوں نے تمھارا نمک بھی نہیں چکھا۔"
شاہ جی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔" دلالی کرتے کرتے داداگیری تو نے کب سے شروع کر دی؟ زیادہ پینترے بازی نہ دکھا، مارا جائے گا۔"
رحمان نے رونی صورت بنا کر بولا۔" جب ہی تو تمھارے لیے مال نہیں لاتا۔"
"چل چل ٹسوے نی بہا۔ سو اور لے لے۔"
رحمان نے تھوڑی حیل و حجت کرنے کے بعد شاہ جی کو پندرہ سو روپے پر راضی کر لیا۔"(۱۵)

شاہ جی جب راجا اور نوشا کو کام میں لگاتا ہے تو راجہ ایک انجینئر کے گھر نوکری کرتا ہے۔ اس گھر میں رہ کر اس کے اندر خواہش پیدا ہوئی ہے کہ وہ بھی جرائم کی دنیا سے نکل کر شریفانہ زندگی بسر کرے لیکن حالات ایسے خراب ہوتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ راجہ ان لاکھوں بچوں کا نمائندہ ہے جو معاشی حالات کی خرابی کی وجہ سے اچھی زندگی نہیں گزار سکتے۔ راجہ کا باپ ہجرت کے دوران بچھڑ گیا تھا اور ماں معاشی مجبوری کی وجہ سے رنڈی کا پیشہ اختیار کر لیتی ہے۔ راجہ کا کردار معاشی استحصال کا شکار کردار ہے۔

نوشا پہلے نیاز کے کہنے پر عبد اللہ مستری کی ورکشاپ سے آلات چوری کرتا ہے اس کے بعد ماں کی مار سے بھاگ کر کراچی چلا جاتا ہے۔ شاہ جی کے کہنے پر چوریاں کرتا ہے۔ جیل جاتا ہے وہاں سے وہ جیب کاٹنے کا ہنر سیکھتا ہے۔ وہ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے غلط کاموں میں پھنستا جاتا ہے۔ جب وہ ایک پروفیسر کے گھر جاتا ہے تو اس کی بیٹی سے عشق کر بیٹھتا ہے لیکن وہ اپنی محبت کو نہ اپنا سکا۔ اس جگہ اس کا بھیانک ماضی اپنے تمام تر معاشی مجبوریوں کے ساتھ اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ پروفیسر نے نوشا کو اس کے جرائم اس طرح بیان کیے ہیں :

"تم ابھی تک جرائم پیشہ ہو، اپنی بربادی کا انتقام تم معاشرے سے لو۔ تم مجھ سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے۔ ہرگز نہیں۔ تم سزا یافتہ ہو۔ جیب کترے ہو، اٹھائی گیر ہو۔ میں تم کو اس بات کا ہرگز حق نہیں دے سکتا کہ تم میری بیٹی کے ساتھ فلرٹ کرو۔" (۱۶)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

نوشا کی محبت میں ناکامی اس کی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے تھی۔ آخر میں جب راجہ بہت کسمپرسی کی حالت میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہوتا ہے تو وہ نوشا کے سامنے اعتراف کرتا ہے کہ اس میں لوگوں کا قصور نہیں ہے بلکہ ان کی قسمت ہی کھوٹی ہے۔ اس طرح شوکت صدیقی نے ان تین بچوں کے معاشی استحصال کے حوالے سے معاشی تصورات کو پیش کیا ہے۔

اس ناول کا کمزور ہیرو 'سلمان' ہے۔ سلطانہ سے محبت کرنے کے باوجود اس کو اس لیے نہ اپنا سکا کہ اس کے پاس معاشی وسائل ہی نہ تھے کہ وہ شادی کے رشتے کو نبا سکے۔ سلطانہ ساری رات دلہن بنی اس کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہ آیا۔ سلمان نے اپنے نہ آنے کا عذر معاشی مجبوری کی صورت میں پیش کیا:

> "بات یہ ہے کہ اس رات جب تمھارے گھر سے نکل کر گیا تو میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اور یہ تو تم جانتی ہو کہ ایسی حالت میں، میں تم کو اپنے ہمراہ لے جاتا۔ اس رات میں اپنے ہر دوست اور جاننے والے کے پاس گیا۔ مگر کوئی بھی میرے آڑے وقت پر کام نہیں آتا۔۔۔شاید تمھیں معلوم کہ میں ایک عرصے سے پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں۔ ابّا جان نے خرچ بھیجنا بند کر دیا ہے۔ میری تعلیم بھی ادھوری ہے۔ ملازمت تلاش کر رہا ہوں۔ وُہ ابھی تک نہیں ملی۔" (۱۷)

سلمان اپنے تمام مسائل کی ذمہ داری معاشی حالات کی ابتری پر ڈال دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مستقبل کے بارے میں سوچنے کا حق صرف امیروں کو ہے کیونکہ ان کے پاس اتنے زیادہ معاشی وسائل ہوتے ہیں کہ وہ معاشرے سے الگ رہ کر بھی اپنی مرضی سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ ان کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ سلمان بھی معاشی مسائل کی وجہ سے اپنی محبت کو نہیں اپنا سکا۔ وہ بہتر مستقبل کا خواہاں ہے جب اس کے گھر والے اس کا رشتہ صوبائی اسمبلی کے رکن کی بھتیجی سے طے کرتے ہیں تو سلمان معاشی لالچ میں آکر شادی کے لیے مان جاتا ہے۔ شوکت صدیقی اس صورت حال کو یوں لکھتے ہیں :

> " مگر جب ماں نے بتایا کہ لڑکی کا چچا صوبائی اسمبلی کا ممبر ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ چچا نے اولاد کی طرح اسے پالا پوسا ہے۔ وہ پانچ ہزار روپے نقد دے گا اور اس کے علاوہ ملازمت بھی دلوائے گا۔ یہ سن کر سلمان کو سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔ اس نے سوچا زندگی میں آگے بڑھنے اور شادمانی و کامرانی حاصل کرنے کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ صرف چور دروازے سے اندر داخل ہوا جا سکتا ہے، اور صوبائی اسمبلی کے ممبر کے پاس اس چور دروازے کی کنجی ضرور ہو گی۔"( ۱۸)

سلمان کو شادی کے بعد اچھی ملازمت بھی مل جاتی ہے اور کراچی آنے کے بعد اچھا گھر بھی مل جاتا ہے۔ اس طرح وہ شادی کے بعد اپنی خوشحال معاشی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

اس ناول کے اندر ایسے کردار بھی ملتے ہیں جو معاشی ترقی کے لیے عورت کو سیڑھی بناتے ہیں۔ ان میں انیس احمد جعفری کا کردار ایسے ہی لوگوں کا نمائندہ ہے۔ جو معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے ہر جائز اور ناجائز ذریعہ معاش استعمال کرتے ہیں۔ جعفری اپنے آفیسرز کو خوش کرنے اور اپنی ترقی کے لیے سلمان کی بیوی رخشندہ کا استعمال کرتا ہے۔ رخشندہ بھی ایسی عورتوں کی نمائندہ کردار ہے جو عزت سے زیادہ روپے پیسے اور زیورات کو اہمیت دیتی ہیں۔ رخشندہ بلند معیار زندگی کی خواہش مند ہے۔ وہ جعفری کے ساتھ ہوٹلوں میں جاتی ہے۔ جعفری آہستہ آہستہ اس کا جنسی استعمال شروع کرتا ہے اور اپنے امریکن باس کے سامنے پیش کر کے ترقی حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح مصنف نے جعفری اور رخشندہ کے روپ میں بھی معاشی تصورات کو پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس بارے میں لکھتے ہیں :

> ''خدا کی بستی ' میں غربت اور ہوس زر کی آویزش کو سماجی جرائم اور اخلاق باختہ کرداروں سے نمایاں کیا ہے۔ اس ناول کے نظریاتی مقاصد بے رحم حقیقت نگاری میں چھپ جاتے ہیں۔ سلطانہ، نوشا اور ان کی ماں، نیاز، بیمہ ایجنٹ، راجہ، ڈاکٹر اور سلمان سب معاشرے کے حقیقی کردار ہیں۔''(۱۹)

اس ناول میں شوکت صدیقی نے جرائم کے حوالے سے بھی معاشی تصورات کو پیش کیا ہے۔ اس ناول میں ایسے کردار بھی ہیں جو معاش کے لیے جرائم کا رستہ اختیار کرتے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد معاشی بدحالی نے پورے نظام کو مفلوج کر دیا تھا۔ لوگوں کے پاس آمدنی کے ذرائع نہیں تھے۔ اسی وجہ سے لوگ دوسروں سے ان کا حق چھننے لگے۔ سب سے پہلے ہمیں راجہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو مانگنے کی عادت کہاں سے پڑی ہے۔ ہجرت کے بعد اس کی ماں اس کو یتیم خانے میں ڈال کر رنڈی کا پیشہ اختیار کرتی ہے تو ماں کے بعد یتیم خانے کا مہتمم اس پر بہت ظلم ڈھاتا ہے۔ وہ بچوں کو بھیک مانگنے کے لیے بھیجتا ہے، جو کم پیسے لاتا ہے اس کو گھناؤنی سزا دی جاتی ہے۔ 'شاہ جی' بھی اہم کردار ہیں۔ یہ چور گینگ کا نمائندہ ہے۔ جو گھر سے بھاگے ہوئے بچوں کی معاشی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اور ان سے چوری کرواتے ہیں۔ 'استاد پیڈرو' بھی ایک ایسا ہی کردار ہے۔ جس کا پیشہ بھی بچوں کو غلط راستے پر لگانا ہے۔ وہ گھر سے بھاگے ہوئے بچوں کو ' جیب مارنے ' کی تربیت دیتا ہے۔ اور ان کو شہر کے اندر پھیلا دیتا ہے تاکہ وہ جیب کتر کر پیسے لے کر آئیں۔

اس ناول میں ہمیں متوسط طبقے کے حوالے سے بھی معاشی تصورات کا بیان ملتا ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ معاشی زندگی سے مجبور ہو کر غلط طریقے اختیار کرتے ہیں۔ اس ناول میں ایک ایسا شخص بھی ملتا ہے جو سائیکل کی دکان چلاتا ہے۔ یہ اس قدر مفلس ہے کہ دو وقت کا کھانا کھانا بھی اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ ایک روز تنگ آ کر نوشا اور راجہ کو اصلاح دیتا ہے کہ وہ سوئی لے کر سائیکل پنچر کر دیں۔ اس طرح اس کی گاہکی بڑھے گی اور وہ دونوں کو ایک مقرر کمیشن بھی دے گا۔ اس ناول میں ہمیں ہجڑے بھی دکھائی دیتے ہیں جو اپنے کولہے مٹکا کر پیسے کماتے ہیں۔ انھوں نے معاشی مجبوریوں کی وجہ سے یہ راستہ اختیار کیا۔ '' انّو'' بھی آخر میں ایسے ہی لوگوں کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس ناول میں ان لوگوں کو بھی بے نقاب

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

کیا گیا ہے۔ جو معیشت کے حصول کے لیے اور جرائم کرنے کے لیے اولیائے کرام اور بزرگان دین کے مزاروں پر چرس اور بھنگ کا کاروبار چلاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ضیف الاعتقاد لوگوں کو دین کے نام پر لوٹتے ہیں۔ ان سے مذہب کے نام پر نذر و نیاز وصول کرتے ہیں۔

شوکت صدیقی نے اس ناول میں مختلف کرداروں کی وساطت سے نہ صرف معاشی مسائل کو بیان کیا ہے بلکہ اس کے حل کی ایک اصلاحی تنظیم بھی دکھائی ہے۔ جس کا رہنما پروفیسر احمد علی ہے۔ اس کے علاوہ ریاض، صفدر، بشیر اور سلمان اس کے 'اسکائی لارک' ہیں۔ اس تنظیم کا مقصد لوگوں کو روزگار مہیا کرنا ہے۔ بے بس اور حالات کی ستائی ہوئی عورتوں کو پناہ دینا اور ملازمتیں دینا ہے۔ تعلیم بالغاں کے لیے سکول، مدرسے اور ہسپتال قائم کرنا ہے۔ تاکہ غریب اور مفلس لوگوں کی مدد ہو سکے۔

شوکت صدیقی نے اس ناول میں متوسط طبقے، سرمایہ دار طبقے اور جرائم پیشہ افراد کے حوالے سے معاشی تصورات کو پیش کیا ہے۔ اس لیے معاشی لحاظ سے یہ ناول بہت اہمیت رکھتا ہے۔

## جانگلوس

شوکت صدیقی کا آخری ناول "جانگلوس" ہے۔ "جانگلوس" تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۸۷ء میں دوسری جلد ۱۸۸۹ء میں اور تیسری جلد ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آئی۔ اس ناول میں انہوں نے پنجاب کے دیہی علاقے میں زمینداروں اور جاگیرداروں کی معاشی اجارہ داری، غریب کسانوں اور مزارعوں کا معاشی استحصال اور افسر شاہی کی معاشی عیاشیوں کے حوالے سے معاشی تصورات کو بیان کیا ہے۔

اس ناول کا اصل موضوع جاگیر دار طبقہ کی بالادستی اور غریبوں کا استحصال ہے لیکن شوکت صدیقی نے اس ناول میں جو واقعات اور کردار پیش کیے ہیں ان میں بہت تنوع ہے۔ ایک کردار کے توسط سے عام کرداروں سے واقفیت دلائی گئی ہے۔ ایک کہانی سے دوسری کہانی جنم لیتی ہے۔ ایک کردار کے پیشے سے باقی تمام کرداروں کے پیشے سامنے آتے ہیں۔ اور یہ پیشے انتہائی رزیل ہیں جن کو پڑھ کر قاری حیران رہ جاتا ہے۔

اس ناول میں اہم کردار لالی اور رحیم داد کا ہے۔ یہ دونوں جیل سے بھاگے ہوئے مجرم ہیں۔ لالی عادی مجرم ہے۔ چوری کرنا اس کا پیشہ ہے۔ رحیم داد قتل کے سلسلے میں جیل گیا تھا۔ لیکن خوشحال زمیندار تھا۔ لالی کے ذریعے ہم مختلف پیشہ ور لوگوں سے ملتے ہیں۔ ان میں ہمیں معمولی بھینس چور، پاؤندنے اور ان کی جنگلوں میں رہائش، ان کے مختلف پیشے، فیض محمد جو جانور اور مختلف اشیاء سمگلنگ کرتا تھا۔ حیات محمد، ظالم جاگیر دار اور بیرسٹر۔ ریاض محمد وٹو، ظالم جاگیر دار۔ شبیر اور

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

سکندر کا قبرستان سے مردوں کے پنجر نکالنا، ڈپٹی کمشنر ہمدانی اور ان کے ساتھیوں کی معاشی عیاشیاں، کلراٹھی زمین پر کام کرنے والے مزدور،،، نواب فخر وکا اپنی زمینوں میں اضافہ کے لیے اپنی بیٹی کو استعمال کرنا، حکیم صوفی نذر محمد چشتی جو جڑی بوٹیوں کا علم رکھتا ہے اور طرح طرح کی ادویات بتاتا ہے۔ چوہدری نورالٰہی جو ہجرت کے بعد زمینیں الاٹ کرواتا ہے۔

چوہدری اللہ وسایا جو زمیندار ہے۔ جاگیر دار احسان شاہ جو ظالم اور بے رحم جاگیر دار ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے مزارعے، کسان، مزدور اور بھٹہ پر کام کرنے والے پتھیرے وغیرہ شامل ہیں۔ شوکت صدیقی اس ناول کے شانِ نزول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ”میں سماجی اور اقتصادی تناظر میں ملک کے معروضی حالات کے متعلق ایک سلسلۂ مضامین لکھ رہا تھا۔ یہ مضامین سیاسی اور نظریاتی نوعیت کے تھے۔ ان میں وقائع نویسی کے بجائے بنیادی مسائل سے بحث کی گئی تھی۔ اس سلسلہ کا ایک مضمون طبقاتی تضاد اور محنت کے استحصال کے بارے میں تھا۔ موضوع چونکہ سنجیدہ اور قدرے فلسفیانہ تھا۔ لہٰذا مضمون کا لب ولہجہ اور اسلوب بھی سنجیدہ تھا، مگر عنوان کچھ افسانوی قسم کا تھا، یعنی ”چھوٹے چور بڑے چور“ عنوان کی افسانویت پر غور کرتے کرتے میں چونکا۔ سوچا یہ تو ایسا مرکزی خیال ہے جس پر ناول لکھا جاسکتا ہے۔“(۲۰)

اس ناول میں معاشی حوالے سے چھوٹے چور وہ ہیں جو جیل سے بھاگے ہوئے ہیں۔ وہ چھپتے چھپاتے جوں جوں ناول میں آگے بڑھتے ہیں وہاں ان کی ملاقات بڑے چوروں سے ہوتی ہے۔ یا وہ ان بے بس لوگوں سے ملتے ہیں جو بڑے چوروں کا شکار ہوتے ہیں۔ جانگلوس، جیل سے مغرور دو قیدیوں کی سرگزشت ہے۔ ان میں سے ایک رحیم داد تھا جو منٹگمری جیل میں بلوے اور اقدام قتل کے جرم میں تین سال قید بامشقت کی سزا کاٹ رہا تھا۔ دوسرے کا نام لال دین عرف لالی تھا جو چوری کے جرم میں ڈیڑھ سال کی سزا بھگت رہا تھا۔

پاکستان کی معیشت بنیادی طور پر زرعی ہے۔ اس پر جاگیر دارانہ نظام کی اجارہ داری، بہت عرصے سے ہے۔ ملکی سیاست میں بھی جاگیر داروں کا عمل دخل ہے۔ اسی لیے پنجاب کے زمینداروں اور جاگیر داروں کے ظلم و بربریت کی داستانیں اور معاشی حوالے سے فائدے حاصل کرنے کے لیے نت نئی چالیوں کے حوالے سے بھی معاشی تصورات اس ناول میں پیش کیے گئے ہیں۔

سب سے پہلے اس ناول میں ہمیں جس چور سے واسطہ پڑتا ہے وہ ”پھجا“ ہے۔ جس کا کام جانور چوری کرنا ہے۔ اس نے ایک بھینس چوری کی ہے۔ اس کو لالی نے مویشی چور کا نام دیا۔ پھجے نے خود اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے کہا:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

"میں نے جی پہلے اُہر جانا ہے" اس نے شمال کی سمت ہاتھ اٹھایا۔ "اُہر" پنج میل ادھر جھنگر میں ہے۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہو گا چوری کے ڈنگر اٹھانے کے بعد اُہر ہی میں چھپا کے رکھے جاتے ہیں۔"(۲۱)

اس طرح شوکت صدیقی نے چھوٹے چھوٹے چوروں کا ذکر کیا ہے۔ چوروں کو چور ہی ملتے ہیں۔ لالی کے کہنے پر بھجے نے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ لالی کے ذریعے ہم پاوندوں کے ڈیرے کا بھی چکر لگاتے ہیں۔ لالی کی ملاقات سب سے پہلے خانہ بدوش لڑکیوں سے ہوتی ہے۔ جو بڑی بے باکی سے لالی کو دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ پاوندوں کے ڈیرے میں جاتا ہے۔ لالی کے ذریعے ہمیں ان کے پیشوں کا پتہ چلتا ہے:

"پاوندے ان خانہ بدوش قبائل میں سے تھے، جو موسم سرما شروع ہوتے ہی افغانستان کے کوہستانی دروں سے نکل کر پنجاب اور سندھ کے میدانی علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اینٹوں کے بھٹوں پر پتھیروں کا کام کرتے ہیں۔ دیہات کے کچے مکانات کے لیے مٹی کی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ شہروں اور قصبوں میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ کمبل اور غدے، بھیڑ اور لومڑی کی کھالیں، قراقلی ٹوپیاں، جڑی بوٹیاں، خشک میوے، ہینگ اور مشک گھوڑے، ایرانی بلیاں اور گرے ہاؤنڈ شکاری کتے فروخت کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں سخت جفاکش، محنتی اور منہ زور ہوتی ہیں۔۔۔ پاوندوں میں جرائم پیشہ بھی ہوتے ہیں جو ڈاکہ زنی اور مویشیوں کی چوری کرتے ہیں یا چرس اور افیون کا ناجائز دھندا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس ان کی نقل و حرکت کڑی نگرانی کرتی ہے۔"(۲۲)

شوکت صدیقی نے اس ناول میں پاوندوں کے ذریعۂ معاش پر مکمل روشنی ڈالی ہے۔ یہ لوگ محنت مزدوری کر کے بھی روزی کماتے ہیں اور انہی لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ناجائز ذرائع سے روزی کماتے ہیں۔ ان کی معیشت کا انحصار صرف مردوں پر ہی نہیں بلکہ عورتوں پر بھی ہوتا ہے۔

لالی جب شاداں کے گھر سے واپس آتا ہے تو اس وقت شاداں کی بھینس کو گاؤں کے نمبردار نے گولی مار دی تھی۔ شاداں کے پاس روزی کا واحد ذریعہ یہ بھینس تھی۔ اس کا شوہر 'بالا' اس کو شادی کے بعد چھوڑ گیا تھا۔ وہ دوسروں کے گھروں میں کام کرتی اور اس کے ساتھ ساتھ بھینس کا دودھ اور مکھن بیچ کر اپنا اور بالے کی عیاشیوں کا سامان فراہم کرتی تھی۔

لالی کے ذریعے ہم ایک ایسے زمیندار سے ملتے ہیں۔ جو اسمگلنگ کا کام کرتا ہے۔ لیکن پہلے اس نے اپنی اصلیت چھپائی وہ اپنا تعارف لالی کو اس طرح کرواتا ہے:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

"فسادات اور بلوے ہوئے تو لٹ پٹ کر پاکستان آ گیا۔ کچھ دن ٹھوکریں کھاتا رہا، پھر پاک پتن میں سکول ماسٹر لگ گیا۔ سوئی پت میں کچھ زراعی اراضی تھی۔ اس کا کلیم داخل کیا۔ بھاگ دوڑ کی تو کلیم منظور ہو گیا اور اس چک میں الاٹمنٹ بھی مل گیا۔ سکول ماسٹری چھوڑ چھاڑ یہاں آ گیا۔ اب غلہ منڈی میں آڑھت کا کام بھی کرتا ہوں۔ چار مربعے لگ بھگ زمین ہے۔"(۲۳)

فیض محمد نے اپنا ذریعہ معاش آڑھت اور زمینداری بتایا لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ فیض محمد اپنی بیٹی کی شادی لالی سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی بیٹی کسی اور سے پیار کرتی تھی۔ وہ جس سے پیار کرتی تھی وہ پیشے کے اعتبار سے پروفیسر تھا اور یہ لڑکی اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی۔ فیض محمد کی بیٹی لالی کے پاس چل کر آتی ہے اور اس کو منع کرتی ہے کہ اس سے شادی سے انکار کر دے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے باپ کی اصلیت بھی کھول کر بیان کرتی ہے۔ طاہرہ بتاتی ہے:

"وہ ایک نمبر فراڈ ہیں۔ پہلے تو انہوں نے چار سو بیسی کر کے بوگس کلیم منظور کرایا، پرائمری سکول کے معمولی ماسٹر سے بڑے زمیندار بن گئے۔ پھر غلے کی آڑھت کا کاروبار شروع کر دیا۔۔۔ آڑھت کا تو صرف بہانہ ہے۔ وہ سمگلنگ کرتے ہیں۔ وہ کنک اور چینی بھیجتے ہیں۔ ادھر سے ہندوؤں کی بیمار اور بوڑھی گائیں بھینسیں لاتے ہیں۔ دن بھر سمگلنگ کا دھندا کرتے ہیں۔۔۔ وہ تمہیں اپنے سمگلنگ کے دھندے میں ایجنٹ کے طور پر استعمال کریں گے۔ تاکہ رینجرز اور بارڈر پولیس کے ساتھ گولی چلے تو تم ہی مارے جاؤ۔"(۲۴)

فیض محمد ایک اسمگلر تھا۔ وہ زرعی مصنوعات سے چینی اور کھاد وغیرہ باہر بھیجتا تھا اور بھینسیں برآمد کرتا تھا۔ اس طرح فیض محمد کے ذریعے شوکت صدیقی نے اس دور کے اہم غیر قانونی اور گھٹیا ذریعۂ معاش کے حوالے سے معاشی تصورات کو پیش کیا ہے۔ ناول نگار لالی کو لے کر آگے بڑھتا ہے۔ اب ہمیں بہت بڑے جاگیر دار سے ملاتا ہے۔ اس جاگیر دار کا نام "میاں حیات محمد وٹو" ہے۔ حیات وٹو، بیرسٹر بھی ہے اور جاگیر دار بھی ہے۔ اس نے اپنے بھائی کو دولت کی لالچ اور جاگیر پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی ذاتی جیل میں بند کیا ہوا ہے۔ یہ جاگیر ان کے پاس کیسے آئی اس کے بارے میں ریاض وٹو خود لالی بتاتا ہے:

"یہ جائیداد مجھے اپنے پیؤ سے ورثے میں نہیں ملی۔۔ وہ تو معمولی زمیندار تھا۔ ان کے پاس ۲۵ ایکڑ سے بھی کم اراضی تھی۔ ان کو زمین داری سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

وہ چاہتے تھے کہ میں پولیس میں بھرتی ہو جاؤں یا پٹواری لگ جاؤں۔۔۔ اتنی بڑی جاگیر
میں نے اپنی اپنی صلاحیت اور محنت سے حاصل کی ہے۔"(۲۵)

ریاض وٹو بڑا بھائی تھا اور حیات محمد وٹو چھوٹا بھائی تھا۔ ریاض وٹو نے حیات کی پرورش اپنے بیٹوں کی طرح کی تھی۔ پھر اس کے ہاں خود بھی ایک بیٹا نیاز پیدا ہو گیا۔ حیات کو پڑھنے کے لیے باہر بھیج دیا گیا۔ حیات نے اپنی پسند کے مطابق بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن اس نے واپس آکر پریکٹس نہ کی بلکہ بادشاہ گری کی۔ لالی کے کہنے پر ریاض بتاتا ہے کہ بادشاہ گیری کیا ہوتی ہے:

"وہ یہ ہوتی ہے کہ کسی کو اسمبلی کا ممبر بنوا دیا، کسی کو وزیر لگوا دیا، کسی پارٹی کو اوپر
کرا دیا، کسی کو نیچے۔ کبھی اس ٹولے کے ساتھ، کبھی اس ٹولے کے ساتھ، کہتا ہے،
اصل سیاست یہی ہے۔ پیچھے بیٹھے ڈوری ہلاتے رہو۔"(۲۶)

حیات وٹو کی لالچ بڑھتی گئی۔ اس لالچ میں اس نے اپنے باپ جیسے بھائی کو اپنی ذاتی جیل میں قید کر دیا۔ اس کو پاگل پن کے انجکشن لگاتا۔ تاکہ اس کی جائیداد پر قبضہ کر لے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے بیٹے نیاز کو بھی راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ حیات وٹو اپنے بڑے بھائی کے ناجائز کاموں کے بارے میں بھی بتاتا ہے کہ اس نے یہ جاگیر کس طرح حاصل کی اور اس کا بیٹا نیاز ایک کرنل جانسن کا بیٹا ہے۔ کیونکہ یہ جاگیر حاصل کرنے کے لیے اپنی جوان بیوی کو اس کے پاس بھیجتا تھا۔

محمد حیات بھی دولت کے لالچ اور اسمبلی میں سیٹ حاصل کرنے کے لیے اپنی بیوی ناصرہ کو ایم۔ سی۔ اے کے پاس بھیجنا چاہتا ہے تاکہ اس کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو سکے۔ وہ اس سے پہلے بھی ایسا کئی بار کر چکا ہے۔ حیات وٹو اپنے معاشی فائدے کے لیے اپنے بھائی کو جیل میں بند کرتا ہے، اپنے بھتیجے کو مارنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی بیوی کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

'ناصرہ' کے میکے والے معاشی لحاظ سے بہت خوشحال تھے بلکہ وہ "لنگریال" کہلاتے تھے۔ یعنی ان کے در لنگر بنے ہوئے تھے اور کوئی ان کے در سے کھائے بغیر واپس نہیں جاتا تھا۔ لیکن ناصرہ کے ساتھ اس قدر غیر انسانی سلوک اس لیے ہوتا کہ ان کے خاندان میں طلاق کا تصور نہیں تھا۔

لالی سرکاری ریسٹ ہاؤس میں چند دن گزارتا ہے۔ اور ان دنوں میں اس نے وہاں دیکھا کہ کس طرح سرکاری آفیسرز اپنے مفادات کے حصول کے لیے اور اپنے بڑے آفیسرز کو خوش کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈوں میں مصروف ہیں۔ سب سے پہلے تو ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے ایک ایسے آفیسر کا ذکر کیا جس نے اپنی بیوی کو غلط کاری کی بنا پر گولی ماردی تھی۔ پولیس آئی لیکن اس آفیسر نے پیسے دے دلا کر معاملہ ٹھنڈا کروالیا اور راتوں رات اس ریسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔ لالی نے اس ریسٹ ہاؤس میں دیکھا کہ ایک اور سیز صفدر نے اپنی نوکری کی بحالی کے لیے اپنی بیوی زرینہ کو استعمال کیا۔ زرینہ تقریباً

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

بیس سال کی لڑکی تھی۔ اس کا شوہر اس کو اپنے آفیسر کے ساتھ رات گزارنے کے لیے ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کے لوگ اپنے معاشی مفادات کے لیے اپنی بیویوں کا بھی سودا کر جاتے تھے۔ دولت کی لالچ میں رشوت لیتے ہیں اور پھنس جانے کی صورت میں اپنی بیویوں کو رشوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لالی نے صفدر کی بیوی کو کہا:

"صفدر نے تجھے رشوت میں انجینئر کو پیش کیا ہے۔ تیرا کھسم ہے بہت تیز۔ رشوت لینا بھی جانتا ہے اور رشوت دے کر بچ نکلنے کا رستہ بھی جانتا ہے۔"(۲۷)

شوکت صدیقی نے قبرستان اور انسانی ڈھانچوں کے حوالے سے بھی معاشی تصورات کو اس ناول میں پیش کیا ہے ۔لالی ریسٹ ہاؤس سے نکل کر قبرستان پہنچ گیا۔ اس جگہ شوکت صدیقی نے معاشرے کے ایک گھناؤنے رخ کو پیش کیا ہے۔ لوگ اپنے گزر بسر کے لیے مردوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ ناول نگار نے ایک نہایت غیر اخلاقی اور ناجائز ذریعہ معاش کا ذکر کیا ہے۔ جس کا سن کر انسان کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لالی کی ملاقات قبرستان میں بشیرے کے ساتھ ہوتی ہے۔ بشیرا 'مردوں کے پنجر' بیچنے کا کاروبار سکندر اور اس کے باپ کے ساتھ مل کر کرتا ہے۔ پہلے سکندر کی بیوی اس راز کو افشا کرتی ہے:

"میں نوں اتنا پتہ ہے کہ وہ پنجروں کی ہڈیاں بکسوں میں بند کر کے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔" وہ چند لمحے چپ بیٹھی رہی پھر کہنے لگی۔ "اس نے چچا اور سکندر کو بھی اسی رستے پر لگا دیا ہے۔ ذرا سوچ کتنا گندہ کام ہے۔ مردوں کی مٹی خراب کرتے انہیں ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔"(۲۸)

بشیرا کراچی سے آتا تھا۔ وہ مردوں کے پنجرے کراچی کی ایک کمپنی کو سپلائی کرتا تھا۔ بشیرے کے علاوہ بھی بہت سے لوگ یہ ذریعہ معاش اپنائے ہوئے تھے۔ کراچی کی کمپنی یہ پنجر دوسرے ملکوں کو ایکسپورٹ کرتی تھی۔ بشیر ابتاتا ہے:

"آج کل مال یونان اور اٹلی جا رہا ہے۔ پانچ سو ڈھانچوں کا آرڈر ہے۔"(۲۹)

دوسرے ملکوں کے لوگ یہ پنجر خرید لیتے ہیں اور اپنے میڈیکل کالج اور یونیورسٹیوں میں ان کو پڑھائی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسپتالوں اور دوا بنانے والی کمپنیوں کو بھی ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ حکومت کو بھی ان باتوں کا علم ہے کہ ی پنجر کہاں سے آتے ہیں۔ لیکن وہ کچھ نہیں کہتی بلکہ اس طرح کے کام کرنے والی کمپنیوں کو لائسنس دیتی ہے۔ بشیر ابتاتا ہے:

"کمپنی کے پاس حکومت کی طرف سے باقائدہ ایکسپورٹ لائسنس ہے اور کمپنی بھی کوئی ایسی ویسی نہیں، برٹش کمپنی ہے۔ دوائیں تیار کرتی ہے۔ پاکستان میں کمپنی کا سول

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

ایجنٹ اپنا حاجی صالح بھائی کافور والا ہے۔ بہت کاروبار ہے اس کا مجھ سے تو پنجر اور ڈھانچے وہی خرید تا ہے۔"(۳۰)

شوکت صدیقی نے یہ بھی بتایا کہ ہسپتالوں میں آنے والی لاوارث لاشیں کے حوالے سے بھی معاشی تصورات کو پیش کیا ہے۔ یہ لاوارث لاشیں کچھ عرصہ کے لیے مردہ خانوں میں پڑی رہتی ہیں۔ بعد میں ڈاکٹری پڑھنے والے اسٹوڈنٹس ان کی چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہی لاشیں اسپتال کے اندر ہی ایک حصے میں زمین کھود کر دبادی جاتی ہیں۔ جب سال سوا سال کے بعد ان کھال اور گوشت گل سڑ جاتا ہے اور صرف ہڈیاں اور پنجر رہ جاتے ہیں تو اسے نکال کر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سرکاری اور غیر سرکاری ہسپتال بھی مردوں اور پنجروں کو بیچ کر پیسہ حاصل کرتے ہیں۔ جو ایک ناجائز اور حرام ذریعہ معاش ہے۔ شوکت صدیقی نے نہایت مکروہ ذریعہ معاش سے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہیں کہ لوگ نہ صرف مجبوری میں بلکہ دولت کی لالچ میں بھی یہ کاروبار کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ حکومت اور پولیس دونوں اس ناجائز کاروبار میں شامل ہیں۔

شوکت صدیقی نے ایک ڈپٹی کمشنر کے ذریعے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور بیوروکریٹس طبقہ کی بداعمالیوں اور غلط کاریوں کے حوالے سے معاشی تصورات کو بیان کیا ہے۔ کس طرح یہ لوگ عوام کی مدد کرنے کی بجائے اپنی دولت کے نشے میں ناجائز کام کرتے ہیں اور اس کام میں اپنی بیویوں کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ اس سرکاری عہدے داروں نے اپنی عیاشیوں کے لیے " پولی نیسین کلب" بنایا ہوا تھا۔ جس میں میاں بیوی دونوں شریک ہوتے تھے۔ اور ایک رات سب قرعہ اندازی کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ رات گزارتے تھے۔ اس طرح جائز طریقے سے ایک دوسرے کی بیوی کا استعمال کرتے تھے اور مزے کی بات یہ کہ ان کی بیویاں بھی اس کام میں خوش تھیں۔

کلب کے ان ممبران میں سے ایک شیخ عبدالمجید گلوں تھا۔ جس کے لائل پور میں دو بڑے کارخانے تھے۔ چوہدری نواز بھنڈر تھا وہ ریلوے کے بڑے عہدے پر فائز تھا۔ مرزا ابوالحسن ایس۔ پی آفیسر تھا۔ ڈاکٹر بٹ محکمہ صحت کا ڈائریکٹر تھا۔ سب سے آخر میں مسعود تھا جو محکمہ آبادکاری میں ایڈیشنل کمشنر تھا۔ چند سال تک بنگال میں مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکا تھا۔ اس کلب کے اندر سارے آفیسرز تھے۔ جو اپنا فارغ وقت اس طرح رنگ رلیوں میں گزارتے تھے۔ ہمدانی نے اس کلب کی افادیت بتاتے ہوئے کہا:

"ہمدانی نے ہنس کر کہا۔" اس لیے تو فساد کی جڑ زر اور زمین کے ساتھ زن کو بھی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ ہر قتل کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے۔"
ہمدانی کہتا رہا۔" یار! بات صرف اتنی ہے کہ ہم نے اپنی جوروؤں کے ایک چھوڑ چھ سات یار پیدا کر دیئے ہیں۔ جب سے ان کے یار پیدا ہوئے ہیں، وہ روز بروز زیادہ جوان اور زیادہ خوبصورت ہوتی جارہی ہیں۔۔۔۔۔اس یاری آشنائی کا فائدہ یہ ہے کہ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

اپنی جورو بھی ہاتھ سے نہیں جاتی اور پرائی جورو کا ذائقہ بھی چکھنے کو مل جاتا ہے۔ نہ اغوا کرنے یا پھانسنے کا چکر نہ نئی شادی رچانے کا جھنجٹ۔"(۳۱)

ہمدانی نے یہ بتایا کہ سارے ڈپٹی کمشنر اور افسر ایسے نہیں ہوتے بلکہ کوئی کوئی ہوتا ہے۔ ہمدانی کی باتیں سن کر لالی نے کہا کہ جب اس کی ماں کو زمیندار زبردستی اٹھا کر لے گیا تھا تو اس کے باپ نے اس کا گناہ کبھی معاف نہ کیا بلکہ مار مار کر اس کی جان لے لی۔ لالی غمگین ہو کر کہتا ہے:

" دنیا میں سارا کھیل پیسے کا ہے۔ پیسہ آدمی کے سب عیب چھپا دیتا ہے۔"(۳۲)

ہمدانی کے ہاں لالی کو ایک آفیسر پہچان لیتا ہے لالی وہاں سے بھاگتا ہے تو اللہ دتہ نامی شخص سے ملتا ہے۔ اللہ دتہ کے ذریعے ایک ایسے زمیندار سے ملاقات ہوتی ہے جس کا ذریعہ معاش زراعت تو تھا ہی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کلراہٹی زمینوں پر غریب کسانوں اور محنت کشوں سے کام لیتا تھا اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ مزدوروں سے جسمانی کام لینے کے ساتھ ساتھ ان کی عورتوں کو عیاشی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لالی نے اللہ دتہ سے مل کر ان تمام لوگوں کو آزاد کرا دیا جو بیگار ادا کرتے تھے۔

شوکت صدیقی نے حکیم نذر محمد چشتی کے ذکر سے 'حکیم' کے پیشے سے متعلق معاشی تصور کو بھی پیش کیا ہے۔ رحیم داد سے اس کی ملاقات اس وقت ہوتی ہے جب وہ مختلف ادویات بنانے کے لیے جڑی بوٹیاں چن رہا تھا۔ حکیم نذر اپنے اس پیشے کے بارے میں یوں بتاتا ہے:

"میں یہاں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں آتا ہوں۔۔۔۔۔۔ یہ جھاڑیاں اور بوٹے دیکھ رہے ہو۔ یہ قدرت کا انمول خزانہ ہے۔ ان بوٹوں کی پتیوں، جڑوں، ڈنٹھلوں میں نہ جانے کیسی کیسی بیماریوں کا علاج چھپا ہوا ہے۔ مگر اسے ڈھونڈنے اور پہچاننے کے لیے نظر چاہیے۔"(۳۳)

حکیم مختلف جڑی بوٹیوں کے مفید فائدے بتاتا ہے۔ پھر مزید اپنے پیشے کے بارے میں رحیم داد کو بتاتا ہے:

"میں ان جڑی بوٹیوں سے مختلف دوائیاں تیار کرتا ہوں۔۔ کمال گڑھ میں میرا مطب ہے۔ دور دور سے مریض آتے ہیں۔"(۳۴)

جو ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران گورداسپور (ہندوستان) سے ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ وہ اپنی متروکہ جائیداد کے کلیم کی بنیاد پر زمین کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں دفتروں کے چکر کاٹتا رہتا ہے۔ رحیم داد کو چوہدری نور الٰہی نے بتایا کہ اعلیٰ افسران اور منچھی طبقہ سب رشوت لے کر کام کرتے ہیں۔ جائز کام بھی رشوت دے کر نکالنا پڑتا ہے:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

"سچ تو یہ ہے جی، پٹواری الاٹمنٹ منسوخ بھی کرا سکتا ہے اور وہی الاٹمنٹ دلا بھی سکتا ہے۔" نور الٰہی نے گہری سانس بھری۔ "الاٹمنٹ کی منظوری یا منسوخی کی پوری عمارت پٹواری کی رپورٹ ہی پر کھڑی ہوتی ہے۔" (۳۵)

رحیم داد کے مختلف سوالات کے جواب میں نورالٰہی پٹواری، ڈپٹی کمشنر اور تحصیل داروں کی غلط کاریوں کے بارے میں بتاتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہاجرین کو قیام پاکستان کے بعد جن معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں زیادہ ان پٹواریوں اور تحصیلداروں کے پیدا کردہ تھے۔ آخر کار رحیم داد نے بھی دولت کی ہوس میں چوہدری نورالٰہی کا قتل کر دیا اور اس کے کلیم کے کاغذات لے کر وہاں سے بھاگ گیا۔ رحیم داد کے ذریعے ہم جلد دوم اور سوم میں مختلف زمینداروں، جاگیرداروں سے ملتے ہیں۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظلم و ستم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ رحیم داد نورالٰہی کی شناخت لے کر تحصیل دیپال پور آ پہنچتا ہے۔ تو اس کی کوٹلہ ہرکشن کے زمیندار اللہ وسایا سے ملاقات ہوتی ہے۔ اللہ وسایا بہت رحم دل اور نیک شخص ہے۔ رحیم داد اس کی حویلی میں ایک فرد کی طرح رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ وسایا کی معاشی مدد بھی کرتا ہے۔ رحیم داد نے جو کلیم کے کاغذات نورالٰہی سے حاصل کیے تھے وہ اللہ وسایا کو دے کر اس کی زمینیں اور حویلی بچالی تھی۔

احسان شاہ ایک ظالم اور جابر جاگیر دار تھا۔ وہ اپنے مزارعوں اور ملازموں پر بے حد ظلم ڈھاتا۔ اس نے اپنی معیشت کو مستحکم کرنے کے اپنے مزارعوں کو اپنے اشاروں پر نچانے کے جبلیں بنا رکھی تھیں۔ بڑے بڑے سرکاری افسروں سے دوستیاں تھیں۔ رشوت دے کر قانون کو اپنے ساتھ ملایا ہوا تھا۔ جو مزارع اس کی نافرمانی کرتا تو وہ اس کی فصلوں اور گھر بار کو آگ لگا دیتا تھا۔ اس کی زمین پر قبضہ کر لیتا۔ اس کے مویشی چوری کرواتا۔ عورتوں کو اغوا کرا کے اپنی حویلی میں بند کر دیتا۔ اس کے نزدیک جاگیر داری چلانے کا یہ اصول تھا۔ اس طرح اس کی معیشت میں اضافہ ہوتا جاتا اور مزارعوں پر معیشت کے تمام دروازے بند ہوتے جاتے۔

لالی جیل کی سزا کاٹ کر شاداں کے ساتھ اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتا ہے۔ بھٹے پر بھی مالک کی طرف سے مزدوروں پر مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ شاداں اور لالی حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے وہاں پھنس گئے تھے۔ شاداں تو بیماری کا بہانہ کر کے وہاں سے نکل آئی لیکن لالی کا نکلنا مشکل تھا۔ کیونکہ پتھیروں کی سخت نگرانی کی جاتی تھی۔ وہ سارا سارا دن اینٹیں بناتے اور رات کو کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا تھا۔ شوکت صدیقی نے بھٹوں پر کام کرنے والوں کے حوالے سے بھی معاشی تصور کو بیان کیا ہے۔ شوکت صدیقی نے اس ناول میں طبقاتی کشمکش کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے معیشت کے حوالے سے تمام ناجائز اور غیر اخلاقی و غیر قانونی ذرائع معاش کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ مجرم صرف اخلاقی اقدار یا قانوں کی خلاف ورزی کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ دہشت گردی، ظلم و تشدد، تخریب کاری اور دوسروں کی حق تلفی کرنے والے بھی مجرم ہیں۔ اور ان جرائم میں عوام کے ساتھ ساتھ حکومتی مشینری بھی برابر کی شریک ہے۔ اس مسئلے کو جانگلوس میں کھل کر بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

"یوں یہ محض چار درویش ہی کی داستان نہیں بلکہ کئی مجرموں اور مظلوموں کی داستان ہے۔"(۳۶)

اس ناول میں بے شمار کردار ہیں۔ اور یہ کردار کسی مخصوص پیشے کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً حیات محمد وٹو، ڈپٹی کمشنر ہمدانی، احسان شاہ، اللہ وسایا، محمد فیض۔ ان کے علاوہ غریب کسان، مزارعوں، مزدوروں اور پتھیروں کے بے شمار چھوٹے چھوٹے کردار ہیں۔ جو استحصال زدہ طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لیے ستار طاہر لکھتے ہیں:

"جانگلوس، پنجاب کی الف لیلہ ہے۔ اس پنجاب کی، جس کی تاریخ ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہوئی۔ جانگلوس، اردو زبان میں مغربی پنجاب کی تکنیک اور فارم کے لحاظ سے وہ الف لیلہ ہے جس میں حقیقت نگاری حقیقی معنوں میں اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔"(۳۷)

جاگیر دارانہ نظام کی خامیوں، پولیس اور اعلی سرکاری افسروں کی عیاشیاں، بادہ نوشی، رشوت ستانی اور قیام پاکستان کے بعد متروکہ جائیدادوں کی الاٹمنٹ کی صورت میں پیدا ہونے والی معاشی ابتری اور بدحالی، عورتوں کا معاشی فائدے کے لیے استعمال، معاشی فائدے کے لیے بھائی کے ہاتھوں بھائی کا قتل، دولت پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی بہنوں، بیٹیوں کی شادیاں نہ کرنا، یا قرآن مجید سے نکاح کر دینا، کلراٹھی زمین میں کمیوں اور مزارعوں پر ہونے والا ظلم، اور بھٹہ مزدوروں اور پتھیروں پر ڈھائے جانے والے ستم اور ان کو دی جانے والی سنگین سزائیں۔ اس ناول کا موضوع ہیں۔ کمال احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"انہوں نے جانگلوس جیسا بڑے کینوس کا ناول تین ضخیم جلدوں میں لکھ کر اپنے عہد کے پاکستان کے جاگیر دارانہ نظام کر ہر رخ سے مرقع پیش کر دیا ہے۔"(۳۸)

اس طرح ناول نگار نے چھوٹے چوروں اور بڑے چوروں کے ذریعے پنجاب کی اس وقت کی معیشت اور عوام کے معاشی حالات کے حوالے سے معاشی تصورات کو بیان کر دیا ہے۔ یہ پنجاب کی غیر اخلاقی اور غیر قانونی ذرائع معاش پر لکھا جانے والا اہم ناول ہے۔

## حاصلِ بحث

۱۹۴۷ء میں ملکی تقسیم اور اس کے بعد کے واقعات کے نتیجے میں پیدا ہونی والی صورت حال نے بر صغیر پاک وہند کی عوام پر عام طور پر اور ادیب خاص طور پر ان سے متاثر ہوئے۔ ان لکھنے والوں شوکت صدیقی خاص طور پر اہم ہیں۔ شوکت صدیقی نے ناول 'خدا کی بستی' میں قیام پاکستان کے بعد کے نیم سرمایہ دارانہ معاشرے میں جمہوریت، انسانیت اور مذہب کی آڑ میں معاشی استحصال کے حوالے سے معاشی تصورات کو پیش کیا ہے۔ ہماری روز مرہ زندگی کے مسائل اور تلخ حقائق کو مختلف پیشوں کی وساطت سے اس ناول میں پیش کیا گیا ہے جس کو پڑھ کر قاری کی روح کانپ جاتی ہے۔ اس ناول میں معاشی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

لحاظ سے تین طبقات بیان کیے گئے ہیں۔ ایک سرمایہ دار طبقہ ہے اور دوسرا متوسط طبقہ ہے اور تیسرا جرائم پیشہ افراد کا طبقہ ہے۔ناول 'جانگلوس' کا اصل موضوع جاگیر دار طبقہ کی بالادستی اور غریبوں کا استحصال ہے لیکن شوکت صدیقی نے اس ناول میں جو واقعات اور کردار پیش کیے ہیں ان میں بہت تنوع ہے۔ایک کردار کے توسط سے عام کرداروں سے واقفیت دلائی گئی ہے۔ایک کہانی سے دوسری کہانی جنم لیتی ہے۔ایک کردار کے پیشے سے باقی تمام کرداروں کے پیشے سامنے آتے ہیں۔اور یہ پیشے انتہائی رزیل ہیں جن کو پڑھ کر قاری حیران رہ جاتا ہے۔شوکت صدیقی نے اپنے ان دونوں ناولوں میں پاکستان کے قیام کے بعد کے معاشی حالات کو جرائم پیشہ افراد کے حوالے سے بیان کیا ہے، جن میں کباڑے، ڈاکٹروں کا منفی کردار، اغواء ،چوری، ڈاکہ، قتل و غارت، استعماری قوتیں، ناجائز منافع خوری، اپنوں کا قتل، امیر طبقے کی عیاشیاں اور سرمایہ داروں کا منفی کردار خاص طور پر قابل ذکر ہے

## حوالہ جات


۱۔ فیروزدین، مولوی، فیروز اللغات، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۶۶

۲۔ سورۃ النباء:۷۸

۳۔ سورۃ القصص:۲۲۸

4. Encyclopedia of the social science ,Edited by Luzec and co, London : Russell street 1927, p.168

۵۔ غفاری، نور محمد، ڈاکٹر، اسلام کا معاشی نظام، لاہور: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، ۱۹۹۴ء، ص ۴۳

۶۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، کراچی: رکتاب پبلیشرز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۴

۷۔ محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول میں آزادی کے تصورات، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۶، ص ۸۷۱

۸۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، ایضاً ص ۶۵۱

۹۔ ایضاً ص ۳۰۔۲۹

۱۰۔ ایضاً ص ۲۴۰

۱۱۔ ایضاً ص ۹۴

۱۲۔ ایضاً ص ۳۲۳

۱۳۔ ایضاً ص ۱۰

۱۴۔ ایضاً ص ۱۸۳

۱۵۔ ایضاً ص ۱۱۷

۱۶۔ ایضاً ص ۴۰۰

۱۷۔ ایضاً ص ۱۷۸

۱۸۔ ایضاً ص ۴۱۶

۱۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، ۱۹۸۸ء، ص ۵۷۲

۲۰۔ شوکت صدیقی، جانگلوس، کراچی: رکتاب پبلی کیشنز، جلد اوّل، ۱۹۸۶ء، ص ۵

۲۱۔ شوکت صدیقی، جانگلوس، جلد اوّل، کراچی: رکتاب پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴

۲۲۔ ایضاً ص ۶۹۔۶۸

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol5No.2021

۲۳۔ ایضاً ص ۹۰

۲۴۔ ایضاً ص ۱۰۷۔۱۰۶

۲۵۔ ایضاً ص ۱۷۴

۲۶۔ ایضاً ص ۱۷۸

۲۷۔ ایضاً ص ۲۴۳

۲۸۔ ایضاً ص ۲۶۶

۲۹۔ ایضاً ص ۲۶۷

۳۰۔ ایضاً ص ۲۶۸

۳۱۔ ایضاً ص ۳۴۷

۳۲۔ ایضاً ص ۲۴۸

۳۳۔ ایضاً ص ۴۶۵

۳۴۔ ایضاً ص ۴۶۶

۳۵۔ ایضاً ص ۵۰۰

۳۶۔ مشتاق احمد قدوائی، ڈاکٹر، جانگلوس، کا تنقیدی مطالعہ، مشمولہ، قومی زبان، جلد ۴۷، شمارہ ۵۰، جولائی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۔۱۱

۳۷۔ ستار طاہر، چار دیواری، انحطاط پذیر معاشرے کا مرقع، مشمولہ، مجلہ ساتواں عالمی اردو ادب ایوارڈ، دوحی قطر، ۲۰۰۲، ص ۲

۳۸۔ کمال احمد صدیقی، شوکت صدیقی کی یاد میں، مشمولہ: روشنائی، جلد نمبر ۸، سہ ماہی، شمارہ نمبر ۷ (مدیر: احمد زین الدین) کراچی: جنوری تا جون، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۳